مقالات

اقتصادی تعبیرِ تاریخ
اور
اسلام

(جناب فضل الرحمٰن صاحب فریدی ایم۔ اے)

غالباً جب سے انسان نے فکر اور تدبر سے کام لینا شروع کیا اُسی وقت سے یہ مسئلہ اُس کے لیے حیرت اور دلچسپی کا موجب بنا رہا ہے کہ انقلابات کیوں آتے ہیں؟ کل ہم نے جن قوموں اور گروہوں کو حکمراں دیکھا تھا آج وہ محکوم کیوں ہوگئے؟ پچھلے زمانے میں انسانی تمدن کے جو مظاہر تھے آج کیوں ناپید ہوگئے؟ اور اُن کی جگہ کیوں دوسرے مظاہر کا قبضہ ہے؟ اس محیر العقول مسئلہ کا مختلف جواب ہمیشہ ملتا رہا۔ کسی کے نزدیک یہ ساری توڑ پھوڑ زندگی کی ناپائداری اور بے ثباتی کا ثبوت بن گئی، اور اُس نے قنوطیت کا سہارا لیا! کسی کی نظر میں اہلِ اقتدار کی باہم کشاکش اصل سبب قرار پائی، بعضوں کی فکر نے اس طرف رہنمائی کی کہ فطری عوامل اُس انسان ہی کو بدل دیتے ہیں جو ان تمام چیزوں کے پیچھے اصل قوت ہے، اس کی تبدیلی سے عمارت تبدیل ہوجاتی ہے۔ الغرض بے شمار جوابات ہیں جو اس مشکل کو حل کرنے کے لیے عقلِ انسانی نے پیش کیے۔ اِن میں سے کوئی جواب محض علمی دُنیا تک محدود رہا، بلکہ اُس کے اثرات عملی زندگیوں پر مترتب ہوئے۔ اس جواب کے نتیجہ میں صاحبانِ فکر نے اپنی زندگیوں کے طرز کو تبدیل کیا اور اُس کی طرف دوسروں کو بھی دعوت دی۔ ان تعبیرات میں سے ایک نہایت اہم تعبیر وہ ہے جو گذشتہ صدی کی پیداوار ہے۔ اس وقت ہم اسی سے بحث کریں گے۔

اگرچہ اِس تعبیر کا "خالق" دُنیا سے گذر گیا، لیکن اس کے خیالات آج بھی ذہنوں پر مستولی ہیں۔ سائنس سے لے کر تاریخ، اخلاقیات، فلسفہ، معاشیات اور معاشرت تک اس سے متاثر ہیں۔ بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ

عصرِ حاضر میں تحریکیں بھی اسی بنیاد پر چلتی ہیں، سیاست کا ڈھانچہ بھی یہیں سے غذا حاصل کرتا ہے، طرفہ تماشہ یہ کہ وہ حضرات بھی بُری طرح اس سے متاثر ہیں جن کا وظیفۂ حیات اب یہی بن چکا ہے کہ وہ اس کی اور اس کے خالق کی بیخ کنی کریں۔ اگر مارکس آج زندہ ہوتا تو غالباً اس کے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کی بات یہی ہوتی کہ مخالفین بھی اس کے حلقہ بگوشِ فکر ہیں۔

اجتماعی زندگی میں آنے والے انقلابات کی مارکسی توجیہ پر غور کرنے سے پیشتر ہمارے نزدیک یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے اس توجیہ کے مقصد پر غور کرلیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ پرولتاریوں کو سرمایہ دارانہ نظام کے استیصال کا فرضِ منصبی ادا کرنے کا اہل بنایا جائے۔

لینن نے اس امر کی تشریح کرتے ہوئے کہ کمیونسٹ پارٹی کو پرولتاریوں کا لیڈر بننا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنا ہے، یہ بتایا تھا کہ پارٹی پرولتاریوں کا وہ باشعور طبقہ ہے جسے اپنا مشن انجام دینا ہے۔ "چنانچہ اس کام کو انجام دینے کے لیے، پارٹی کو بداہتہً علم، سمجھ اور دوربینی کی ضرورت ہے، بالفاظِ دیگر اس کو ایسے انقلابی نظریہ سے مسلح ہونا چاہیے جس پر اس کی پالیسی مبنی ہو اور جو اس کی سرگرمیوں کی رہنمائی کرے ...."

"اور اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں ایک فلسفہ طلوع ہوا ہے جو محنت کرنے والے طبقے کے انقلابی نظریۂ کائنات کا مظہر ہے۔ اور یہ بھی کہ اس فلسفہ — جدلی مادیت کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ یہ مارکسی لینینی پارٹی کا نظریۂ کائنات ہے۔"[1]

یعنی مادی تعبیرِ تاریخ جو بہرحال مادی تعبیرِ کائنات کا ایک جزو ہے[2]، ایک بامقصد تعبیر ہے، یہ کوئی غیر جانبدارانہ علمی نظریہ نہیں جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہو کہ یہ تو ایک ایسی اچھوتی علمی تحقیق ہے جو سارے مقاصد سے ماوراء ہے بلکہ یہ فی الحقیقت ایک خاص مقصد کے تحت وجود میں آئی تھی، اور اس وقت تک یہ علمی تحقیق عملی میدان کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اس کی بنیاد پر اجتماعی زندگی کو سمجھا جاتا ہے اور اس میں حسبِ منشا تبدیلی کی جد و جہد کی جاتی ہے۔ اس لیے وہ لوگ جن کا یہ خیال ہے کہ مارکسی تعبیرِ تاریخ پر گفتگو کرنا محض ایک علمی شغلہ ہے، وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں، انھیں یہ معلوم نہیں کہ

---

[1] جدلیاتی مادیت (DIALECTICAL MATERIALISM) صفحہ ۱۵ مصنفہ مارس کارن فورتھ۔

[2] "معاشی اور سیاسی نظریات، عمومی نظریۂ کائنات سے آزاد نہیں ہوتے اور نہ کبھی ہو سکتے ہیں" جدلی مادیت صفحہ ۱۵ مصنفہ مارس کارن فورتھ۔

یہ نظریہ زندگیوں پر کتنے گہرے اثرات ڈالتا ہے، اور کس طرح یہ تحریکوں بالخصوص اشتراکی تحریکوں کے لیے رہنمائی کا کام دیتا ہے۔

یہ ایک نہایت عجیب بات ہے کہ مارکس نے تاریخِ انسانی کی اس تعبیر پر کہیں بھی تفصیلی گفتگو نہیں کی۔ اس وقت ہم مارکس کے نظریۂ کائنات کے صرف اس جزو سے گفتگو کریں گے جو اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی مادی تعبیرِ تاریخ۔ اگرچہ یہ تعبیر اُس عمومی فلسفہ کا ایک جزو ہے جسے جدلی مادیت کہتے ہیں لیکن اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ اس حد تک الگ ہے کہ کُل پر بحث کیے بغیر اس پر گفتگو کرنا ممکن ہے، جہاں تک ممکن ہوگا ہم اس مضمون میں ضروری اشارات کرتے جائیں گے لیکن جدلی مادیت پر تفصیلی گفتگو کرنی ہمارا مقصد نہیں ہے۔

"کریٹک آف پولیٹیکل اکانمی" کے دیباچہ میں مارکس نے اس بات کی تشریح کی ہے کہ ہیگل کے فلسفہ پر نظرثانی کرتے ہوئے کس طرح وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ "نہ تو قانونی علائق کو اور نہ ریاست کی شکل ہی کو بنفسہا سمجھا جا سکتا ہے .... بلکہ یہ کہ ان سب کی جڑیں زندگی کے مادی حالات میں پیوست ہیں۔" آگے وہ لکھتے ہیں کہ "مادی زندگی کا طریقِ پیداوار، زندگی کی معاشرتی، سیاسی اور روحانی پروسس کی عمومی ہیئت کو متعین کرتا ہے۔"

انسان کی اجتماعی و معاشرتی اور انفرادی زندگی میں جو حالات بھی پائے جاتے ہیں، اس کا سیاسی اور اقتصادی نظم جیسا کچھ بھی نظر آتا ہے، اُس کی اخلاقی اور روحانی یا فکری اقدار جیسی کچھ بھی ہوتی ہیں، وہ سب مادی حالاتِ زندگی یعنی مادی طریقِ پیداوار پر منحصر ہوتی ہیں۔ ان حالات میں جو انقلاب آتا ہے اس کا حقیقی اور آخری محرک طریقِ پیداوار کی تبدیلی ہوتی ہے۔ مارکس کے نزدیک جب کسی معاشرہ میں ایک خاص طریقِ پیداوار اختیار کر لیا جاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اجتماعی زندگی میں ہر فرد کو ایک مخصوص نظامِ علائق میں بندھ جانا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ازمنۂ وسطیٰ میں ایک شخص چند اوزار کے ذریعہ، اپنے گھر میں بیٹھ کر ضروریاتِ زندگی کے سامان تیار کرتا تھا تو سوسائٹی کے دوسرے لوگوں سے اُس کے ایک خاص قسم کے تعلقات بن جاتے تھے۔ کسی کے لیے وہ مالک ہوتا تھا، اور کوئی اس کے لیے نوکر، کوئی اُس کے لیے خریدار ہوتا تھا اور کسی کے لیے

وہ سامان کا فروخت کرنے والا ۔ اِن رشتوں کی بنا پر سوسائٹی کا ایک مخصوص ڈھانچہ بن جاتا تھا، اور اسی کے مطابق لوگوں کی اقدار اور اُن کے نظریات بن جاتے تھے ۔ ہر طریقِ پیداوار اپنے زمانہ کے لیے نہایت موزوں اور مناسب ہوتا ہے، لیکن امتدادِ زمانہ سے یہ طریقِ پیداوار نامناسب ہو جاتا ہے ۔ نتیجۃً لوگ اس کی جگہ پر کوئی دوسرا طریقِ پیدائش اختیار کر لیتے ہیں ۔ یہ تبدیلی زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب کا پیش خیمہ بن جاتی ہے ۔ سیاسی نظم بدل جاتا ہے اور معاشرتی اور اخلاقی اقدار میں تبدیلی آجاتی ہے ۔

اگرچہ ہر طریقِ پیداوار اپنے زمانے کے لیے موزوں ہوتا ہے لیکن اس میں بعض ایسے متضاد عناصر ہوتے ہیں جنھیں وہ خود ہی نشوونما فراہم کرتا ہے ۔ بعد میں یہ متضاد عناصر نظامِ غالب سے متصادم ہو جاتے ہیں، اس تصادم سے نظامِ غالب، جو پہلے ہی سے کمزور ہو چکا ہوتا ہے، ختم ہو جاتا ہے، اور ایک نیا نظام جنم لیتا ہے، مثال کے طور پر سرمایہ دارانہ نظامِ اقتصاد میں جو متصادم قوت نشوونما پاتی ہے وہ پرولتاری طبقہ ہے، جو ایک زمانے بعد اتنی قوت بہم پہنچا لیتا ہے کہ خود اُس نظام کو ختم کر دیتا ہے جس سے اس کی پیدائش ہوتی ہے ۔ اس تصادم میں جو قوت فتح یاب ہوتی ہے وہ مستقبل میں قوتِ قاہرہ کے مقام پر فائز ہو جاتی ہے اور ایک نیا طریقِ پیدائش اور اس کی بنیاد پر نئے اجتماعی تعلّقات وجود میں آتے ہیں ۔ نظامِ علائق کی اس تبدیلی سے تصورات کی دنیا بدل جاتی ہے ۔ مثال کے طور پر ازمنۂ وسطیٰ میں جب کہ زمیندار اپنی بستی کے رازق سمجھے جاتے تھے، اور جب ان کی عطا کردہ آراضی سے ضروریاتِ زندگی فراہم ہوتی تھیں، یہ بات عین انصاف تصور کی جاتی تھی کہ کسان سے بے گار لی جائے، اور اگر وہ غریب ظلم سے تنگ آکر بھاگنا چاہے تو اسے قید کر دیا جائے ۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں ایسی پیش کی جا سکتی ہیں جن سے یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے کہ طریقِ پیداوار کی تبدیلی سے فلسفۂ اقدار اور سیاسی نظم تبدیل ہو جاتا ہے، قوانین بدل جاتے ہیں، نظریات اور اخلاق میں وقت کے مناسب تبدیلیاں ہو جاتی ہیں ۔ برٹرینڈ رسل نے ایک جگہ مادی تعبیرِ تاریخ پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اگرچہ یہ دعویٰ غلط ہے کہ مادی تعبیرِ تاریخ کا ہر جزو صحیح ہے لیکن اس میں بڑی حد تک صداقت ہے مثال کے طور پر عورتوں کی آزادی اور ان کی عصمت کے متعلق جو تصوّرات ازمنۂ وسطیٰ میں پائے جاتے تھے، وہ در حقیقت اس اقتصادی سسٹم کا نتیجہ تھے جن میں عورتوں کو اپنی معاش کے لیے مردوں کا دست نگر رہنا ہوتا تھا ۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام

ہی مردوں کے لیے یہ ممکن ہی نہ رہا کہ خود اتنی روزی کما سکیں جو پورے خاندان کے لیے کفایت کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں کو میدان میں نکلنا پڑا۔ بالآخر عصمت اور پرہیزگاری کے روایتی نظریات میں تبدیلی آگئی۔" روایتی صنفی اخلاقیات منہدم ہوگئیں، کیونکہ ان کی ساری بنیاد عورتوں کا اپنے باپوں اور شوہروں پر معاشی انحصار تھا۔"[1]

اس پوری بات کا خلاصہ انجلس کے الفاظ میں یوں کیا جاسکتا ہے کہ مادی تعبیر تاریخ کا مطلب یہ ہے کہ:۔

"ہر تاریخی دور میں معاشی پیداوار اور مبادلہ کا رائج طریقہ، اور اس سے لازماً نکلنے والی اجتماعی تنظیم ہی وہ بنیاد بنتے ہیں جن پر اس دور کی سیاسی اور فکری تاریخ تعمیر ہوتی ہے اور محض اسی (کی مدد) سے اس کی تشریح بھی کی جاسکتی ہے۔"[2]

اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے یہ انقلابات اگرچہ توڑ پھوڑ اور تصادم کے ایک پیہم جاری رہنے والے سلسلے سے تعبیر کیے جاسکتے ہیں لیکن ان کے نتیجے میں جو طریقِ پیداوار اور جو تمدّن رائج ہوتا ہے وہ بہرحال پچھلے دور کے تمدّن کے مقابلہ میں بہتر ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر تصادم کے نتیجہ میں ارتقاء کی طرف قدم بڑھتا ہے۔ مارکس اور اُس کے معتقد حضرات کا اصرار ہے کہ اجتماعی زندگی اور تاریخِ انسانی ترقی پذیر ہے، اس میں کبھی ایسا ممکن نہیں ہے کہ ترقیٔ معکوس قابلِ لحاظ عرصے تک ظہور میں آسکے۔

موجودہ صدی کے آغاز سے، اور ماضی قریب سے بالخصوص، مارکس کی مادی تعبیرِ تاریخ کا نام معاشی تعبیرِ تاریخ رکھ دیا گیا ہے۔ غالباً نام کی یہ تبدیلی اُن تبصروں اور حقائق سے متاثر ہوکر کی گئی ہے جن کا اظہار اکثر کیا جاتا رہا ہے۔ اگر محض نام کی تبدیلی ہوتی تو ہم اسے نظر انداز کر جاتے، لیکن اس تبدیلی کی پشت پر تعبیر و تفہیم میں بھی فرق نظر آتا ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس نئی تعبیر کو اس کے علم بردار حضرات کے الفاظ میں ناظرین کے سامنے پیش کردیں۔ مارکس کے نظریۂ تاریخ کی اشاعت کے بعد اس پر تنقیدوں کا ایک عظیم الشان ہلّہ بول دیا گیا، ان سے متاثر ہوکر انجلس نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ "مارکس اور میں ایک حد تک اس امر کے ذمہ دار ہیں کہ نوجوانوں

---

[1] PRACTICE AND THEORY OF BOLSHEVISM—B. RUSSEL.

[2] COMMUNIST MANIFESTO (ENG.ED.) PUBLISHED. 1888

نے معاشی پہلو پر اس سے زیادہ زور دیا ہے جتنا کہ اس کا حق ہے۔ اپنے مخالفین کے حملوں کا جواب دینے کے لیے ہمارے لیے یہ ضروری تھا کہ ہم اُس غالب اصول پر زور دیں جس کا وہ انکار کرتے تھے' اور (اس بحث میں) ہم کو ہمیشہ اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ .... ہم دوسرے عوامل کو بھی .... ان کا صحیح حق دے سکیں۔"[1]

پروفیسر ای۔ اے۔ آر۔ سیلگمن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ہم تاریخ کی معاشی تعبیر کے نظریہ سے یہ نہیں سمجھتے کہ ساری تاریخ کی تشریح صرف معاشی الفاظ میں کی جائے بلکہ یہ کہ انسانی ارتقاء میں خاص قابلِ غور وجوہات معاشرتی ہیں، اور یہ کہ معاشرتی تبدیلی میں اہم عامل معاشی عامل ہے۔"[2] ایک دوسرا مصنّف لکھتا ہے کہ "مادی تعبیر تاریخ یہ ہے کہ کسی قوم یا معاشرہ کی ترقی میں خاص اور بنیادی عامل معاشی ہے ...."

اس نقطۂ نظر کو پیش کرنے کی غایت صرف یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ جدید مطالب میں اور ماضی کے مطالب میں صرف زورِ بیان کا فرق ہے، ورنہ فی الحقیقت بات وہی کہی جا رہی ہے۔ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ اقتصادی عامل ہی سب کچھ ہے اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ نہیں، اقتصادی عامل اہم ترین عامل ہے اور آخری فیصلہ کن قوت اقتصادی قوت ہوتی ہے۔ بعض لوگ اس نئی تعبیر سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ مارکسی طرزِ فکر میں کوئی بنیادی تبدیلی ہو گئی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض خوش گمانی ہے اور بس۔

مادی تعبیرِ تاریخ کا خلاصہ ہم یوں بیان کر سکتے ہیں:

(۱) اجتماعی زندگی اور تاریخِ انسانی میں پیہم تخریب اور تعمیر کا جو عمل جاری ہے اس کی پشت پر حقیقی یا کم از کم مؤثر ترین طاقت مادی اور اقتصادی ہے۔

(۲) یہ سارے انقلابات اس تصادم کا نتیجہ ہوتے ہیں جو غالب نظامِ اقتصاد، اور اس کی بنیاد پر تعمیر شدہ تنظیمِ اجتماعی، میں نشوونما پانے والے متضاد رجحانات کے درمیان وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

---

[1] ENGELS LETTERS (PR 142) PUBLISHED IN 'DER SOCIALISTICHE A KADEMIKER?

[2] ECON. INTERPRATION OF HISTORY

(۳) تاریخ کے ہر دور میں جو سیاسی، معاشرتی، نظریاتی، اور اخلاقی سسٹم پائے جاتے ہیں اُن کی بنیاد اُس وقت کے اقتصادی طریق پیدائش ہوتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں کبھی کوئی ایسا فلسفہ اور نظریہ نہیں رہا ہے جسے مستقل اور دائمی کہا جا سکے۔ یہاں ہر چیز اضافی اور غیر مستقل ہے۔ بورژوا طبقہ کے عہد میں بورژوا اخلاقیات اور فلسفۂ حیات غالب رہتا ہے جو اُس دور کے لیے موزوں اور ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کا حامل ہوتا ہے لیکن سرمایہ داری کے استیصال کے فوراً بعد دوسرے نظریات اور اخلاقی اقدار کی نئی اقسام وجود میں آتی ہیں۔ انصاف، سچائی، عصمت، اور پرہیزگاری کے تصوّرات یک قلم بدل جاتے ہیں۔

اس فلسفہ کا اجمالی خاکہ ذہن نشین کرانے کے بعد اب ہم اس پر تنقیدی نظر ڈالیں گے تاکہ اس کی اصل پوزیشن واضح ہو سکے۔ سب سے پہلے ہم اس تعبیر کے متعلق یہ غور کریں گے کہ اس میں کتنی خامیاں اور نقائص ہیں؟ زندگی کے کن مؤثر اور محرک قوتوں کو اس میں نظر انداز کیا گیا ہے اور اجتماعی زندگی میں آنے والے انقلابات کو سمجھنے میں اس کے مصنف نے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اس کے بعد ہم اس نظریہ کے عملی پہلو کا تجزیہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ جیسا کہ مقالہ کے آغاز میں بھی ہم نے عرض کیا تھا یہ نظریہ درحقیقت ایک بامقصد علمی تحقیق ہے جس کی غایت اجتماعی زندگی کو ایک خاص نہج پر ترتیب دینا ہے۔ اس لیے ہم یہ دیکھیں گے کہ اس نظریہ کو اختیار کرنے کے بعد اجتماعی زندگی کا نظام کیا بن جاتا ہے اور اس سے انسانیت من حیث المجموع (یا محنت کار طبقہ) اپنی منزلِ مقصود سے قریب ہوتی ہے یا بعید، سب سے آخر میں ہم اسلام کے نظریۂ اجتماع اور اُس کی عطا کردہ تعبیرِ تاریخ کا جائزہ لیں گے۔

ہمارے نزدیک مارکسی نظریہ میں مندرجہ ذیل اہم نقائص پائے جاتے ہیں۔

اجتماعی زندگی میں غیر اقتصادی عوامل

مارکس کی سب سے پہلی غلطی جس نے اس کے نظریات اور فلسفۂ کائنات کے ایک ایک جزو کو متاثر کیا، وہ اقتصادی حالات کی اہمیت میں غیر معمولی شغف تھا۔ ہمارے نزدیک اس کی غلطی کا سبب غالباً وہ حالات تھے جو صنعتی انقلاب سے پیدا ہوئے تھے۔ صنعتی انقلاب کی غیر معمولی ترقی، اور اس کے ساتھ آنے والے تیز رفتار اقتصادی انقلابات نے مارکس کی فکر اور قوتِ مشاہدہ کو غیر متناسب بنا دیا۔ اپنے زمانے کے

حالات کو دیکھ کر اُس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ غالباً ایسے ہی حالات ہمیشہ موجود تھے، اس نے دیکھا کہ صنعتی انقلاب کی لائی ہوئی تبدیلیوں سے خیالات اور تصورات تبدیل ہو رہے ہیں، مذہب اور اخلاق میں انقلاب آرہا ہے۔ فلسفے بدل رہے ہیں۔ اس لیے ان تمام حالات سے فطرتاً جو استدلال کیا جاتا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اجتماعی زندگی میں اصل محرک طاقت اقتصادی ہے۔ حالاں کہ معاشرتی حالات اور اُس کے اجزائے ترکیبی کا جائزہ لینے سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوسکتی تھی کہ ہر انسانی معاشرہ مختلف اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان اجزائے ترکیبی میں ہر ایک جزوِ لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے اور بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، اس لیے کسی بھی جزو کو اتنی اہمیت دینا کہ وہی اصلی قوتِ محرکہ ہے حالات کی ناقص واقفیت کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔

انسانی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ اقتصادی عوامل اجتماعیات میں خاصا اہم رول ادا کرتے ہیں۔ لیکن یہ امر بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ نہ ہمیشہ یہ قوتِ محرکہ بنتے ہیں، اور نہ ہی ہر عہد اور ہر زمانہ میں ان کو نمایاں مقام حاصل رہتا ہے بلکہ بیشتر اوقات اس کے بالکل برخلاف ہوتا ہے۔ اجتماعیات کے علما نے اس سلسلہ میں جو غور و فکر اور تحقیق کی ہے، اُس سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اقتصادی محرکات بسا اوقات ثانوی درجہ اختیار کرجاتے ہیں۔

فکری عوامل۔ ہمارے نزدیک اجتماعی زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کی پشت پر کئی مختلف قوتیں کام کرتی ہیں۔ سب سے اہم اور بنیادی قوتِ محرکہ فکر اور تصورات زندگی ہیں۔ اگرچہ مارکسی نقطۂ نظر سے افکار اور اقدارِ حیات اقتصادی حالات کا صرف انعکاس ہوتے ہیں لیکن اگر آپ تھوڑی دیر کے لیے غیر جانبدار ہو کر حالات کا تجزیہ کریں تو آپ پر یہ حقیقت روشن ہوسکتی ہے کہ افکار اور خیالات کو اقتصادی حالات کا محض عکس قرار دینا صرف فریبِ نظر ہے اور کچھ بھی نہیں[1]۔ اس وقت ہماری بحث کا منشا صرف یہ تعین کرنا ہے کہ کیا اقتصادی محرکات ہمیشہ اصل سبب ہوتے ہیں یا انھیں ثانوی حیثیت حاصل رہتی ہے۔

---

[1] یہ نکتہ "جدلی مادیت" سے متعلق ہے جو اس وقت ہمارا موضوعِ بحث نہیں ہے۔

اجتماعی انقلابات کی ایک قسم تو وہ ہے جسے ہم اصلاحی یا دینی انقلاب کے نام سے پکارتے ہیں۔ مارکسی مصنفین کے نزدیک دینی اور مذہبی انقلابات بھی اقتصادی حقیقتوں کا غیر حقیقی مظہر ہوتے ہیں۔ پچھلے زمانوں میں جب کہ حالات سازگار نہیں تھے اور اقتصادی فلاح و بہبود کے لیے جد و جہد کرنا غالب اخلاقیات کی نظر میں نہایت معیوب سمجھا جاتا تھا، مصلحین وقت اخلاقی اور مذہبی نقاب اوڑھ لیا کرتے تھے اور اپنی ساری جد و جہد اور تحریک کو اُن الفاظ کے بھیس میں چھپاتے تھے جنھیں معروف اخلاقیات کی تائید حاصل ہوتی تھی۔ الغرض وقت کا ابھرا ہوا مذہب مظلوم طبقات کی اقتصادی خواہشات کا محسوس مظہر ہوتا تھا۔ لیکن مذاہب کی تاریخ کیا ہمیں اسی نتیجہ تک پہنچاتی ہے؟۔ کیا واقعی تاریخی تجزیہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ بانیانِ مذاہب اقتصادی محرکات کے تحت کام کرتے تھے؟ کیا اس نظریہ کو اختیار کرنا عقلاً اور نقلاً ممکن بھی ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ساتھ حواریوں نے کیا اس وجہ سے دیا تھا کہ آپ ان کی اقتصادی برتری کے لیے اُٹھے تھے اور آپ کے ساتھ دینے سے نظامِ غالب و قاہر کا استیصال، اور اس کی جگہ پر نیا نظمِ اقتصاد قائم کرنا ممکن تھا؟ اسلام نے جس وقت عرب میں اپنی دعوت کا آغاز کیا اس وقت سے اُس کے داعی علیہ السلام کے افعال اور اقوال کا مطالعہ کیجیے۔ کیا آپ کو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اقتصادی برتری کی ایک تحریک لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اِس وقت تفصیلی بحث کا موقع نہیں ہے۔ بعض چند حقائق کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز جن کلمات سے کیا، اُن میں خدا کی بندگی کے علاوہ اور کسی دوسری غایت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ پھر پورے کی دور میں آپ نے جس طرح عوام الناس کو مخاطب کیا، اس کا طریقہ، اس میں اختیار کردہ الفاظ اور کلمات، ان میں سے کوئی بھی کسی اقتصادی غرض کی طرف مبہم اشارہ بھی نہیں کرتا۔ پھر اس دور میں آپ نے جس ڈھنگ پر اپنے رفقاءِ کار کی تربیت فرمائی جو اخلاق اُن کے اندر پروان چڑھائے، جن مجلسوں سے ان کے قلوب کو رنگ دیا گیا مارکسی طرزِ فکر کے حاملین کو ان میں اقتصادی اغراض کی بو محسوس ہوتی ہے؟ اقتصادی فلاح و بہبود کی جد و جہد پر اکسانا، اور اس غرض کے لیے کام کرنا تو کجا، انھیں تو ان کے آقا اور مولیٰ نے جو تعلیم دی وہ مال و دولت اور اقتصادی فلاح و بہبود کو نظروں میں انتہائی حقیر قرار دینے کا موجب بنتی رہی۔ مدنی دور کو غایتِ تحریک سمجھ کر غور کرنے والے اگرچہ یہ بات کہہ سکتے ہیں

کہ ایسی حکومت کا قیام اور اس کا استحکام کیا اقتصادی محرک کا ثبوت نہیں فراہم کرتا؟ لیکن حالات سے واقف لوگ یہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ مدنی دور میں بھی حضور نے اپنی زندگی میں اللہ کے دین کو غالب کرنے اور خدا پرستی کو قلوب میں راسخ کرنے پر جس طرح اپنی ساری توجہات مرکوز رکھیں وہ اپنی آپ مثال ہے۔

پھر کیا یہ اخلاقی انقلاب محض اخلاقیات تک محدود رہا؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس دینی انقلاب نے افکار اور تصورات کے ساتھ سیاسی، معاشرتی، قانونی، اقتصادی سارا نظام بدل کر رکھ دیا۔ کیا مارکسی نقطۂ نگاہ کے حاملین نے کبھی اِن تبدیلیوں پر غور کرنے کی زحمت بھی گوارا فرمائی ہے؟ اسی طرح اخلاقی دنیا میں لائے ہوئے دوسرے بے شمار انقلابات ایسے ہیں، جن کا اگر محض نام ہی لیا جائے تو شاید اس مضمون میں گنجائش نہ نکلے، خود ہندوستان کی تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، جہاں یہ امر بالکل واضح ہے کہ فکر اور فلسفۂ حیات نے اصل قوتِ محرکہ کا کام کیا۔

ایک دوسرے پہلو سے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اجتماعی انقلابات جن کے متعلق عام طور پر یہ مشہور ہے کہ وہ خالص اقتصادی حالات اور معاشی مقاصد کا نتیجہ ہیں، درحقیقت اُن خصوصی فکری عوامل کی وجہ سے برپا ہوتے ہیں، جنھیں نظر انداز کرنا فیشن میں داخل ہو چکا ہے، گذشتہ صدی میں یورپ میں برپا ہونے والے صنعتی انقلاب نے اگرچہ نظریات کی دُنیا بدل دی، سیاسی اور سماجی اقدار میں عظیم الشان زلزلہ پیدا کر دیا لیکن اگر ان حالات کا تجزیہ کیا جائے جو اس "بے مثال" انقلاب کے محرک ثابت ہوئے تو آپ کو حیرت ہوگی کہ ان میں سے بیشتر وہ ہیں جنھیں ہم فکری یا تصوری محرک کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صنعتی انقلاب کے وقت سے سیاسی دنیا میں جمہوری اقدار کا فروغ ہوا، اور صنعتی دنیا میں محنت کار طبقہ کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کی ابتدا ہوئی، مذہب کا ظالمانہ تسلط ختم ہوا، سائنس نے دماغوں کو وسعت عطا کی اور یہ سب کچھ "بھاپ" اور "بجلی" کی مشینوں کی کارفرمائی تھی۔ لیکن درحقیقت اقدارِ حیات میں انقلاب لانے کی بیشتر ذمہ داری اُس تحریک کی ہے جسے تاریخ میں "نشأۃِ ثانیہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تحریکِ "نشأۃ ثانیہ" نے پچھلے زمانوں کے روم اور یونان کی جن مادی اقدار کو پھر سے فروغ دیا وہ ۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔ اس قدر مؤثر ثابت ہوئیں کہ انھوں نے وقت کی غالب اقدارِ حیات کو بدل کر رکھ دیا۔ اس کے علاوہ سائنس نے کائنات کے متعلق "ارتقائی تصور" کے ذریعہ مذہبی تصور میں جو کمزوری پیدا کی وہ تشکیکی تصور سے جنگ تھی نہ کہ اقتصادی

مقاصد کی اقتصادی مقاصد سے۔

اس سلسلہ میں ایک مشہور ماہرِ اجتماعیات ماکس ویبر (MAX WEBER) کی تحقیق کا حوالہ دینا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ "مذہب کی اجتماعیات" کے متعلق تحقیق کرتے ہوئے انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ یورپ میں صنعتی انقلاب کے وقت رائج پروٹسٹنٹ تصورات کی اہمیت کا تجزیہ کیا جائے۔ چنانچہ WEBER نے تین ایسے معاشروں کا انتخاب کیا جن کے متعلق اُن کی تحقیق یہ تھی کہ اقتصادی لحاظ سے تینوں صنعتی انقلاب کے قریبی زمانوں میں، سرمایہ دارانہ نظام کے لیے سازگار تھے۔ لیکن اس کے باوجود سرمایہ داری کی نشوونما اور اُس کی ارتقا یورپ میں ہوئی۔ موصوف کے خیال میں چین، ہندوستان، اور مغربی یورپ تینوں معاشروں کے اقتصادی حالات سرمایہ داری کی پیدائش اور ارتقاء کے نقطۂ نظر سے تقریباً یکساں سازگار تھے، بلکہ ہندوستان اور چین مقابلۃً زیادہ سازگار تھے[۱]۔ WEBER کے نزدیک اس سوال کا جواب مذہبی اقدار کا اختلاف فراہم کرتا ہے۔ اگرچہ مصنف کے نزدیک مذہبی تصورات نہیں بلکہ مذہبی اغراض جدوجہد کرنے پر اکساتے ہیں لیکن مذہبی اغراض کی تحصیل ان تصورات کی پابند ہوتی ہے جو معاشرہ میں غالب ہوتے ہیں۔ مثلاً نجات کی طلب اگرچہ ہندو اور پروٹسٹنٹ دونوں کو سرگرمِ عمل کرتی ہے۔ لیکن ہندو کے نزدیک دُنیا میں عملی جدوجہد اس مقصد کے لیے بیکار ہے جبکہ مؤخر الذکر کے نزدیک دُنیا میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام ——— یا انگور کے باغ میں مشقت ——— ہی رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کو مختلف نظریات مختلف رُخ پر جدوجہد کرنے پر اُبھارتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ WEBER کے نزدیک صنعتی انقلاب کی ترقی اور نشوونما میں تصورات کو زبردست اہمیت حاصل رہی ہے۔

ماکس ویبر MAX WEBER نے جس انقلاب کا تجزیہ کیا ہے وہ اجتماعی انقلابات کی دوسری قسم ہے جسے اقتصادی یا معاشرتی انقلاب کہہ سکتے ہیں ——— ان دونوں انقلابات سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ فکر اجتماعی زندگی میں قوتِ محرکہ کا رول ادا کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں روسی انقلاب پر بھی اگر ایک سرسری نگاہ ڈال لی جائے تو غالباً موجبِ دلچسپی ہوگا۔ مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام کے استیصال کے سلسلہ میں جو نظریہ پیش کیا تھا وہ یہ تھا کہ اس نظام کا ختم ہونا "تاریخی ناگزیریت" ہے۔ اس کے ثبوت میں ایک طرف تو مارکس کا نظریۂ تاریخ مع اپنے

---

۱ Sociologi of Religions, Max- Araber

تمام دلائل کے موجود تھا جس کی رو سے ہر نظامِ اقتصاد اُسی وقت تک نظامِ مستبد کی شکل میں باقی رہ سکتا ہے جب تک کہ خود اس کے اندر نشو ونما پانے والے متضاد عناصر قوت نہ حاصل کرلیں، اور سرمایہ دارانہ نظام کا متضاد عنصر محنت کش طبقہ قوت حاصل کر چکا تھا، دوسری طرف وہ ثبوت تھے جو عملی حالات فراہم کر رہے تھے یعنی قیمتوں کا اتار چڑھاؤ، بے روزگاری، بڑھتی ہوئی غربت یا بے چارگی اور سرمایہ کا اکتاز وغیرہ "تاریخی ناگزیت" سے مراد مارکس کے نزدیک ایک ایسا حادثہ تھا جو حالات کے فطری نتیجہ کے طور پر برآمد ہو جائے۔ ان حالات کے ظہور پذیر ہونے میں انسان اپنے قول وفعل سے جلدی تو ضرور کر سکتا ہے لیکن اسے ہمیشہ کے لیے روک نہیں سکتا۔ ان سارے دلائل میں مارکس کے نزدیک جو اصل روح تھی وہ اقتصادی محرکات تھے۔ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے اور خود مارکسی طرزِ فکر اس کا ادعا بھی کرتا رہا ہے کہ اگرچہ سرمایہ داری ایک لعنت ہے تاہم یہ ایک ناگزیر مرحلہ ہے۔ بغیر ان حالات کے پیدا ہوئے اشتراکی انقلاب نہیں آسکتا۔ لیکن روس میں یہ انقلاب کیوں آگیا؟ روس، اشتراکی انقلاب کے وقت ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظامِ اقتصاد سے گزر رہا تھا۔ وہاں تو ابھی سرمایہ داری عہدِ طفولیت میں تھی۔ ابھی اس کا عالمِ شباب کوسوں دور تھا۔ اگر اقتصادی حالات اصل محرک بنتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ وہاں یہ اشتراکی انقلاب آگیا۔ درحقیقت روسی اشتراکیت کی تاریخ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ افکار اور نظریات محرکِ محل بنتے ہیں، ورنہ روس میں انقلاب نہ آسکتا۔ حال میں چین میں جو انقلاب آیا ہے وہ اس امر کی دوسری مثال ہے، روس اور چین میں برپا ہونے والے انقلابات میں اُس نظریۂ حیات نے قوی ترین محرک کا کام دیا ہے جو دوسرے ممالک سے درآمد کیا گیا۔

چنانچہ اشتراکی انقلاب کے آغاز ہی میں روس کی پارٹی کے ایک اچھے خاصے گروہ نے اس بات کا احساس کیا تھا کہ ابھی مارکسی نقطۂ نظر سے یہاں پر زمین اشتراکی نظام کے لیے سازگار نہیں۔ اس لیے اس مرحلہ میں ایک ایسی حکومت قائم کرنی چاہیے جو "بورژوا جمہوریت" پر مبنی ہو اور اس کے ساتھ تعاون کیا جائے تاکہ سرمایہ داری فروغ پائے اور وہ حالات پیدا ہو جائیں جن کا فطری نتیجہ اشتراکی انقلاب ہوگا۔ لینن نے اس نقطۂ نظر کا بہت مذاق اڑایا اور اس کے علم بردار حضرات کو پارٹی نے حسبِ معمول "رجعت پسند" قرار دیا۔

جذبات اور محبتیں۔ اجتماعی زندگی میں فکر کی اہمیت سے نہ تو انکار ممکن ہے اور نہ صرفِ نظر، لیکن یہ بھی

حقیقت ہے کہ اس کے علاوہ بھی بعض دوسرے نہایت اہم عوامل ہیں جن کی تائید کے بغیر یا جن کی مخالفت کے علی الرغم اجتماعی انقلابات کبھی وقوع پذیر نہیں ہو سکتے ۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے انسانی نفسیات کا سمجھنا ضروری ہے ۔ انسان نہ تو محض اقتصادی اغراض کا بندہ ہوتا ہے اور نہ عقل و فکر اور تدبر کے سہارے چلنے والی مشین ۔ اگر ایک طرف بسا اوقات وہ اقتصادی فلاح و بہبود کو تصورات کے لیے قربان کر دیتا ہے اور جانتے بوجھتے وہ ایسی ہلاکتیں مول لے لیتا ہے جن سے اُس کی اقتصادی دُنیا بالکل تباہ ہو جاتی ہے تو دوسری طرف وہ فکر و تدبر، تصورات و نظریات اور اقتصادی اغراض سب کچھ محض جذبات کی خاطر قربان کر دیتا ہے سیاسی انقلاب اس حقیقت کی بیّن مثال ہیں ۔ برٹرینڈ رسل لکھتے ہیں کہ سب سے زیادہ واضح غیر اقتصادی عامل ، وہ جس کے اہمال نے اشتراکیوں کو بہت دور لے جا پھینکا ہے، قوم پرستی ہے ۔ مشرقی یورپ میں جو بلکانائزیشن خود اختیاری کے نتیجہ میں واقع ہوا تھا ، وہ اقتصادی لحاظ تباہ کن تھا ۔ اُلسٹر اور بقیہ آئرلینڈ میں جو مخالفت ہوئی تھی اُس کی پشت پر ہرگز کوئی اقتصادی غرض نہیں تھی خود ہندوستان کی تقسیم کسی حیثیت سے اقتصادی بہتری کی ضامن نہیں قرار دی جا سکتی ۔ اور نہ ہی اس عمل کو اقتصادی محرکات کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے پہلی جنگ عظیم سے پیشتر ٹریسٹ (   ) خود کو اطالوی خیال کرتے تھے حالانکہ ان کی خوش حالی آسٹریا پر منحصر تھی ۔ قوم پرستی کے علاوہ خود داری، عناد، اور قوت کی محبت بھی وہ غیر اقتصادی عناصر ہیں جو سیاسی انقلابات کے محرک بنتے ہیں ۔ رسل نے اپنی اسی تصنیف میں لکھا ہے کہ ان غیر اقتصادی عناصر اور بالخصوص اقتدار کی محبت کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ، روس میں اشتراکی انقلاب اپنے مقاصد کے لحاظ سے ناکام رہا، چنانچہ آج بھی (۱۹۲۰ء) روس میں وہ ساری خرابیاں موجود ہیں جو سرمایہ داری میں فروغ پا رہی ہیں ۔

رسل لکھتا ہے، بولشویک طریق کار میں یقین رکھنے والوں کی طرف سے اشتراکیت کی وکالت اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ اقتصادی غلامی کے علاوہ اور کوئی غلامی نہیں ہے .... مجھے اندیشہ ہے کہ یہ محض دھوکا ہے " آگے رسل اس امر پر گفتگو کرتے ہوئے کہ روس میں ایسے آفیسر پائے جاتے ہیں جو اقتدار کا مخزن ہوتے ہیں اور جن سے یہ توقع کرنی کہ وہ اقتدار سے خود دست بردار ہو جائیں گے محض خوش فہمی ہے

لکھتے ہیں" کیا یہ تقریباً ناگزیر نہیں ہوگا کہ ایسے مقام پر فائز لوگ جیسے کہ بولشویک روس میں ہیں، اپنے اقتدار کی اجارہ داری سے دست بردار ہونا ناپسند کریں گے .... ؟ اور کیا یہ ان کے لیے انتہائی آسان نہیں ہوگا کہ بغیر اقتصادی ڈھانچہ کو تبدیل کیے یہ حکام کے لیے وہ عظیم تنخواہوں کا حکم صادر فرما دیں اور اس طرح دولت کی قدیم عدم مساوات پھر سے جاری کر دیں ؟ کون سی غرض انھیں ایسا کرنے سے روکے گی بجز آئیڈیلزم اور انسانیت کی محبت جیسے غیر اقتصادی اغراض کے، جن کی بولشویک مذمت کرتے ہیں، اور دوسری کون اغراض ممکن ہیں؟"[لہ] -

مقید نظام
Closed System

مارکسی تعبیرِ تاریخ کی ایک دوسری خامی وہ ہے جسے ہم تنگئ نگاہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ عجیب تضاد ہے کہ اگرچہ اشتراکیت، بین الاقوامی نقطۂ نظر کو پروان چڑھانے کا عزم و ارادہ رکھتی ہے، اور اُس کے نزدیک اِس سطح زمین پر بسنے والے سارے محنت کش ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں اور ان میں یکجہتی اور اتحادِ فکر و عمل پیدا کرنا وہ عظیم اور مہتم بالشان مقصد ہے جس کے حصول کے لیے اشتراکیت نے عزمِ صمیم کیا ہے لیکن جب تاریخی تجزیہ کے لیے نظریات ترتیب دینے کا وقت آیا تو مارکس کو یہ بات یاد نہ رہی کہ اجتماعی زندگیاں کبھی جغرافیائی حدود میں مقید نہیں کی جا سکتیں بلکہ یہ ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں۔ کسی ایک ملک کی معاشرتی زندگی چاہے ظاہری اطوار اور ڈھانچہ کے لحاظ سے دوسرے ملک کی زندگی سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ نظر آئے لیکن ان میں سے ایک دوسرے کے حالات اور رفتار سے متاثر ضرور ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک مارکس نے اس حقیقت کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا، اگر وہ اُن اثرات کو بھی پیش نظر رکھتا جو دوسری تہذیبوں سے منتقل ہوتے ہیں تو اس کی ترتیب کردہ تعبیر میں زبردست خلا پیدا ہو جاتا، اس لیے مناسب یہی تھا کہ اُسے نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر کسی کو اس تشریح پر اعتراض ہو تو اُس کے لیے بجز اس "غلط" اعتراف کے اور دوسرا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ مارکس کا تاریخی مطالعہ انتہائی ناقص تھا۔ ظاہر ہے کہ اشتراکی حضرات اس اعتراف کے لیے کبھی بھی تیار نہیں ہو سکتے۔

لہ Practice and theory of Bolshevism
—B- AUSSeL. (P. P. 105-106)

اقتصادی تعبیرِ تاریخ اجتماعی زندگی میں برپا ہونے والے انقلابات کی جس طرح تشریح کرتی ہے اس میں صرف انھیں عوامل کا لحاظ کیا جاتا ہے جو ایک خاص ملک میں سرگرمِ عمل ہوتے ہیں۔ ملک کا اقتصادی نظام ایک خاص معاشرتی نظامِ علائق جنم دیتا ہے، اسی نظام کی بنیاد پر معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی زندگی کی عمارت اٹھتی ہے۔ لیکن اسی نظامِ اقتصاد میں چند متضاد رجحانات[1] پرورش پاتے رہتے ہیں، جب ان رجحانات کو طاقت حاصل ہو جاتی کبھی تو غالب رجحانات اور متضاد رجحانات کے درمیان فیصلہ کن تصادم ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں متضاد رجحانات جدید نظامِ اقتصاد کی حیثیت میں ظاہر ہوتے ہیں، نتیجۃً زندگی کے دوسرے شعبے بھی بدل جاتے ہیں، غیر اقتصادی شعبہ ہائے حیات کو اقتصادی شعبہ کے مطابق ڈھلنا پڑتا ہے۔ یہ سارا فلسفہ اُس وقت تک تو کسی حد تک شاید صحیح بھی قرار دیا جا سکے (اگرچہ ہمارے نزدیک وہ اس صورت میں بھی غلط ہے) جب تک کہ ہر ملک کی اجتماعی زندگی دوسرے ممالک کے انقلابات سے بالکل غیر متعلق ہو لیکن اگر وہ دوسرے ممالک کی تہذیب سے متاثر ہو سکتی ہے تو اس فلسفہ کی رہی سہی عمارت بھی بودی ثابت ہو جاتی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک غیر ملکی تہذیب کے فکری انقلابات، اپنے ملک کے رجحانات کو اس حد تک متاثر کر دیں کہ تاریخ کا رُخ ہی بدل جائے۔ فاتح ممالک کی تہذیبی اقدار نے بیشتر مفتوح ممالک کو اسی حد تک متاثر کیا ہے۔ ہم اس سلسلہ میں دو ممالک کی مثال دینے پر اکتفا کریں گے۔ ایک مثال ترکی کی ہے صنعتی انقلاب کے بعد سے جو فکری تبدیلیاں یورپ میں ظہور پذیر ہوئیں اُن کے اثرات عربی ممالک بالخصوص ترکی میں بہت تیزی سے پھیلے۔ ترکی میں یہ اقدار

---

[1] جدلی مادیت کے نزدیک دنیا میں جتنی چیزیں بھی پائی جاتی ہیں اُن میں متضاد عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ اس تضاد کی موجودگی خود اس شئے کی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ ہر قدرتی مظہر اور اُس کے تضاد کے درمیان باہمی تعاون بھی ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے بغیر نشو و نما نہیں پا سکتا لیکن بالآخر متضاد عنصر غالب آ جاتا ہے۔ مثلاً سرمایہ دارنہ نظام کا متضاد عنصر پرولتاری طبقہ ہے، ان میں سے ہر ایک اپنی زندگی اور نشو و نما کے لیے دوسرے کا محتاج ہے۔ نہ پرولتاری طبقہ سرمایہ دار کے بغیر وجود میں آ سکتا ہے اور نہ سرمایہ داری بغیر پرولتاریوں کے نشو و نما پا سکتی ہے، لیکن بالآخر پرولتاری طبقہ غالب ہو جاتا ہے۔

ذہنوں اور دماغوں پر اس حد تک غالب ہو گئیں، اور آنکھوں پر انھوں نے ایسے رنگین چشمے پہنا دیے کہ وہاں پچیس سال کے اندر ترکوں نے ان اقدارِ حیات کو پسِ پشت ڈال دیا جنھیں صدیوں سے وہ سینوں سے لگائے بیٹھے تھے۔ یہ تبدیلی درحقیقت اُن اثرات کا نتیجہ تھی جو اہلِ فرنگ ترکی میں چھوڑ گئے تھے، اور جنھوں نے کمال اتاترک جیسے افراد کے ذہنوں کو مسموم کر دیا تھا۔ ترکی میں یہ فکری اقدار اُس وقت غالب ہوئیں جب کہ اقتصادی نظام کم از کم نصف صدی پیچھے تھا۔ دوسری مثال ہندوستان کی ہے۔ اگرچہ ہندوستان کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ اس ملک میں مغربی اقدار نے اتنا ہی فروغ پایا جتنا ترکی میں لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ انگریز فاتح نے ہندوستان میں کم از کم ایک عظیم الشان تبدیلی ضرور کی۔ اس نے ہندوستان کا مقدس اور بزرگ زاویۂ نگاہ کہ یہ دُنیا بے کار ہے، اس میں رہ کر کسی طرح کی معاشی جدوجہد روحانی ارتقا کی عین ضد ہے، متزلزل کر دیا۔ یہ بات تسلیم کہ یہ تبدیلی صرف پڑھے لکھے طبقے تک محدود رہی، لیکن اس کے اثرات نے ہندوستانی تاریخ کا رُخ موڑ دیا۔ کیا یہ تبدیلی بیرونی فکری اثرات کا نتیجہ نہ تھی۔؟

سائنس نے موجودہ زمانہ میں انسانیت کی ایک عظیم الشان خدمت یہ انجام دی ہے کہ طبعیاتی لحاظ سے ساری دنیا کو ایک شہر بنا دیا ہے، حالانکہ انسان کی فکری وسعتیں ابھی تک محدود پہنائیوں میں مقید ہیں اس دور میں ہر تہذیب ایک دوسرے سے باہم مربوط ہو چکی ہے، دُنیا کے ایک دور دراز گوشے میں ہونے والے واقعات سارے عالمِ انسانیت میں اپنا اثر پھیلا دیتے ہیں۔ اگر پتلون کے فیشن میں آج امریکہ میں کوئی تبدیلی ہو جاتی ہے تو اُسی سال ہندوستان کی پبلک بھی اُسے اپنا لیتی ہے۔ ایسے وقت میں معاشرتی زندگی کو ایک مستقل اور آزاد تنظیم سمجھ لینا جو دوسرے ممالک سے آزاد ارتقار کی طرف رواں دواں رہتا ہے محض خوش خیالی ہی نہیں، کج فہمی بھی ہے۔ ہمارے نزدیک اس اہم بالشان تبدیلی نے مارکسی تعبیرِ تاریخ میں ایک زبردست نقص پیدا کر دیا ہے۔ یہ نقص پہلے بھی تھا لیکن اس کا شعور شاید اتنا واضح نہ ہو سکا تھا جتنا کہ اب ہے۔ [1]

---

[1] ملاحظہ ہو The Meaning of Marxism, G. D. H. Cole (PP. 47)

اجتماعی طاقت

اجتماعی زندگی کے نشیب و فراز کے حقیقی ذمہ دار کون ہیں؟ اشتراکی حضرات کے نزدیک اقتصادی عوامل اور مادی حالات ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت رس نگاہیں خوب جانتی ہیں کہ اجتماعی زندگی اس وقت تک تبدیل نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان اپنا حصہ نہ ادا کر دے۔ آغازِ آفرینش سے لے کر اس وقت تک کی ساری انسانی تاریخ کا مطالعہ کر جائیے، آپ کو ایک سوسائٹی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس میں انقلابات انسان کے علی الرغم آئے ہوں۔ لیکن اقتصادی تعبیرِ تاریخ میں اس بات کا قطعاً لحاظ نہیں کیا گیا۔ مارکسی طرزِ فکر نے اجتماعی حوادث کے اسٹیج سے جس طرح انسانی کردار کو بالکل الگ کر دیا ہے وہ درحقیقت "بورژوائی" طرزِ فکر کا مرہونِ منت ہے۔ اسنادی ماہرینِ معاشیات نے معاشیات کے قوانین ترتیب دیتے وقت اس امر کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا کہ انسانی جذبات بھی اس سلسلہ میں کسی اہم پارٹ کے ادا کرنے والے ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر معاشیات میں اس قسم کے جملے آپ کو بہت ملیں گے۔ "قیمتیں رسد اور مانگ سے متعین ہوتی ہیں" یا "عارفین کے اخراجات آمدنی پر منحصر ہوتے ہیں" گویا قیمتیں اور اخراجات خود بھی ابجیات ہیں اور ان میں یہ قوت پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں تغیر پیدا کر سکیں۔ یہ وہ نفسیات ہے جسے اسنادی ماہرینِ معاشیات نے تسلیم کر لیا تھا اور جس کی بنیاد پر انھوں نے معاشی اصول گھڑے تھے۔ مارکس نے غالباً اسی ماخذ سے یہ نظریہ عاریتہً لیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسانی کردار فی الواقع اجتماعی انقلابات میں اتنا ہی بے بس ہے؟ کیا وہ اپنی سوسائٹی کے مادی حالات کے ہاتھوں محض ایک کھلونا ہے؟ ہمارے نزدیک یہ بات بالکل ہی واہمہ ہے۔ مارکس کے تضادِ فکر کی یہ عجیب مثال ہے کہ "روحانی فکر" کو اُس نے جن بنیادوں پر رد کیا تھا اُن میں بیشتر خود اُس کی اپنی تھیوری میں ویسے ہی موجود ہیں، اگرچہ ان کی شکل میں تبدیلی آگئی ہے۔ مارکسی حضرات کے نزدیک مذہبی طرزِ فکر انسان کو کسی "مافوق الفطرت" ہستی کا غلام بنا دیتی ہے اور اُس سے ساری صلاحیت اور قوتِ فعل سلب کر لیتی ہے اس کو وہ "جبریت" سے تعبیر کرتے ہیں لیکن مارکس نے قوت خدا یا "مافوق الفطرت" ہستیوں سے چھین کر اقتصادی اور سماجی حالات کو بخش دی۔ فرق کیا ہوا؟ ایک شمہ برابر بھی نہیں۔ انسان اب بھی بے چارہ ہے پہلے وہ خدا کے ہاتھوں مجبور و بے کس تھا اب اپنے "پیٹ" کے ہاتھوں ع ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دُنیا نہ وہ دنیا

اجتماعی زندگی کا مکمل تجزیہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسانی کردار کو دو حیثیتوں سے پیشِ نظر رکھا جائے - ایک اس کی اجتماعی حیثیت، اور دوسری انفرادی حیثیت۔ اجتماعی حیثیت میں انسان، معاشرتی بناؤ بگاڑ کی زبردست طاقت ہوتا ہے - اس کی طاقت کے علی الرغم آج تک کبھی اقتصادی یا سماجی انقلاب نہیں آیا ہے اور نہ اس کی تائید کے بغیر یہ ممکن ہے کہ کبھی ایسا انقلاب آسکے - اس سلسلہ میں ہندوستان کا دیہاتی طبقہ قابلِ غور ہے - ہندوستان میں گذشتہ دس پندرہ صدیوں میں جس طرح سیاسی انقلابات آئے اور جس طرح فاتح طاقتوں نے جمے جمائے نظام کو اکھاڑ پھینکا، وہ ہم سب پر روشن ہے - لیکن ہندوستانی دیہاتوں کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی بستیاں اُسی طرح قائم و دائم رہیں جس طرح پہلے تھیں - سوال یہ ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ ایک سبب تو یہ تھا کہ پچھلے زمانے کے انقلابات کے استحکام کے لیے یہ ضروری نہ تھا کہ دیہاتوں کو اپنے ساتھ لے لیا جائے، اس لیے ان کی زندگی میں دخل اندازی کرنے سے قصداً احتراز کیا گیا - لیکن دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ شہروں میں برپا ہونے والے سیاسی، اقتصادی اور سماجی انقلابات سے دیہاتیوں نے صرفِ نظر کیا۔ ایک دوسری مثال محنت کار طبقہ سے ملتی ہے - کیا وجہ ہے کہ انگلینڈ میں اِس وقت تک اشتراکی انقلاب نہیں آسکا حالانکہ سرمایہ داری نے سب سے پہلے انگلینڈ میں دورِ شباب گذارا - ہمارے نزدیک اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس ملک میں محنت کار طبقہ کی اجتماعی طاقت نے اشتراکی انقلاب   کا ساتھ نہیں دیا -

مارکس اور لینن نے اشتراکی انقلاب کے سلسلے میں کمیونسٹ پارٹی کو جو مقامِ امتیاز عنایت فرمایا ہے وہ خود اسی طاقت کا اعترافِ ہے - اقتصادی حالات کے سازگار ہونے کے باوجود کیا وجہ ہے کہ محنت کش طبقہ کو ایک باشعور قیادت کا احساس دلایا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ اجتماعی قوت استعمال میں لائی جائے۔ باشعور قیادت کی کوشش کے بغیر اشتراکی انقلاب آنا ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ محنت کش طبقہ کی اجتماعی طاقت کو حرکت میں لانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کے اندر طبقہ واری منافرت پیدا کی جائے - طبقہ واریت کا شعلہ مشتعل ہونے پر اجتماعی طاقت اقتصادی حالات کا ساتھ دیتی ہے اور اشتراکی انقلاب وقوع پذیر ہوتا ہے۔

لیکن یہ سب پاپڑ کیوں بیلنے پڑتے ہیں جب کہ اجتماعی زندگی میں اصل قوت اقتصادی حالات ہوتے ہیں۔ اس کے دو جوابات ہیں؛ ایک یہ کہ شعور اور فکری طاقتوں کی بیداری کے بغیر انقلاب ممکن نہیں ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ اجتماعی طاقت میں حرکت پیدا کیے بغیر انقلاب ممکن نہیں۔ معلوم نہیں اشتراکی حضرات کے طریقِ کار اور نظریات میں تضاد کیوں ہے اور اسے انھوں نے کیوں برقرار رکھا ہے۔؟

اجتماعی طاقت کی قوت کا شعور آپ ایک دوسری طرح بھی کرسکتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ایک ہی جیسے حالات میں دو طرح کے نظام اختیار کیے جاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی طرح کے اقتصادی حالات میں ایک گروہ ڈکٹیٹرشپ اختیار کرلیتا ہے اور دوسرا گروہ جمہوریت کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر روس کے اقتصادی حالات سے اگر اشتراکیت نتیجۃً برآمد ہوئی تو تقریباً ایسے ہی حالات میں اٹلی اور جرمنی میں نازی ازم اور فاشزم۔

موجودہ دور میں تصوراتی تحریکات (IDEOLOGICAL MOVEMENTS.) کا چلن بھی اس حقیقت کا اعتراف ہے۔ تصوراتی تحریکات کا مقصد فی الحقیقت کسی ایک نظام کا غلبہ ہوتا ہے لیکن یہ تحریکات غلبہ کے لیے اقتصادی حالات کا انتظار نہیں کرتیں بلکہ ان کی بنیاد اس امر پر ہے کہ ذہنوں اور دماغوں کو بدلا جائے اور اس کے نتیجہ میں اُن مظاہر کو جو غلط اثرات ڈال رہے ہیں۔ مثال کے طور پر موجودہ زمانے کی اخلاقی تحریکات اور سیاسی تحریکات پیش کی جاسکتی ہیں جمہوری طرزِ زندگی اسی حقیقت پر تعمیر کی گئی ہے کہ اجتماعی قوت اور اجتماعی شعور بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ گاندھی جی نے اسی حقیقت کو اپنے ایک نہایت مشہور جملے میں ادا کیا تھا۔ "دماغ، قلب کے ماتحت ہوتا ہے" [1]

اجتماعی قوت کی اہمیت پر زور دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس قوت پر مادی حالات بالکل اثر انداز نہیں ہوتے۔ ہمارے نزدیک مادی حالات یقیناً اس قوت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن یہ قوت درحقیقت بے شمار فکری، تصوراتی، اخلاقی، سماجی اور جذباتی، عوامل کا مجموعہ ہوتی ہے، اس لیے یہ امر ناقابلِ تصور ہے کہ اس قوت کو محض اقتصادی محرکات کے نتیجہ میں بدلا جاسکے۔

---

[1] "MIND IS SUBSERVIENT TO HEART"

فرد

اجتماعی زندگی کا نقشہ بنانے، اُس کے ارتقاء کا رُخ متعین کرنے، اور اس کی بنیادیں مستحکم یا کمزور کرنے میں افراد کی شخصیتیں نہایت مؤثر اور طاقتور توانائیوں کی حیثیت سے کام کرتی ہیں۔ اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر کے اجتماعی نقشۂ حیات میں برپا ہونے والی تبدیلیوں کی صحیح اور جامع توجیہ یا تعبیر کرنی ممکن نہیں ہے اور نہ یہی ممکن ہے کہ اجتماعی مفاسد کو دور کرنے، یا اجتماعی فوز و فلاح کے منصوبہ کو نافذ کرنے کے لیے فرد کو نظر انداز کر کے واقعتاً کوئی مفید اور مؤثر قدم اٹھایا جا سکے۔ اشتراکی تعبیرِ تاریخ، اور مارکسی طرزِ فکر کی یہ بنیادی خامی ہے کہ وہ افراد کی شخصیت کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہے۔ یہ خامی اس طرزِ فکر کے ہر گوشہ میں آپ کو نمایاں نظر آئے گی۔ اقتصادی توجیہِ تاریخ کے نزدیک عام افراد کی ذہنیت، اُن کی نفسیات، اور ان کی قابلیتیں اور صلاحیتیں نہ صرف اُن کے مخصوص اقتصادی اور معاشرتی ماحول کا نتیجہ ہوتی ہیں بلکہ ان کو مقامِ امتیاز بھی اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ معاشرتی اور اقتصادی حالات ممد اور مؤید بنتے ہیں، کسی بھی فرد کے اندر فی نفسہٖ کوئی مدبرانہ قوت، لیڈرانہ صلاحیت، اور دوسری صفات جو عظیم شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہیں موجود نہیں ہوتیں، بلکہ حالات انھیں پیدا کرتے ہیں۔ اگر حالات دوسرے ہوتے تو شاید وہ ہرگز نہ پیدا ہوتیں۔ ظاہر ہے کہ جب عظیم شخصیتیں صرف ماحول کی پیداوار ہوتی ہیں اور ماحول کا اصل اور اس کی بنیادی اینٹ اقتصادی ماحول ہوتا ہے تو عظیم افراد کو کسی خاص اہمیت کا حامل قرار دینا محض غلط اندیشی ہے۔

فرد کی اہمیت معلوم کرنے کے لیے ہمیں دو پہلوؤں سے غور کرنا ہوگا۔ ایک پہلو تو یہ ہے کہ فرد جزو ہے اور اجتماعیت کل یعنی انسانی معاشرہ جن اجزاء کا مجموعہ ہے وہ افراد کی شخصیتیں ہیں کُل کے بارے میں کسی صحیح فیصلہ پر پہنچنا ممکن نہیں اگر جُز کے بارے میں معلومات حاصل نہ ہوں، اور نہ ہی جزو کے بارے میں کسی نتیجہ پر پہنچنا صحیح ہوگا اگر کُل کو نظر انداز کر دیا جائے۔ درحقیقت معاشرہ وہ ماحول ہے جس کے اندر فرد پرورش پاتا ہے اور اُس سے متاثر ہوتا ہے معاشرہ کا ماحول اُس کی صلاحیتوں کو نشو و نما دیتا اور نمایاں اور اجاگر کرتا ہے لیکن فرد بھی معاشرہ پر اپنا اثر ڈالتا ہے، وہ اپنے رجحانات اور فکری اقدار کے ذریعہ اپنے اردگرد کے ماحول کو متاثر کرتا ہے، اور کبھی کبھی ماحول کو اپنی ذات کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ غرض یہ کہ فرد اور اجتماعیت کا تعلق دو طرفہ ہوتا ہے۔ اجتماعی زندگی کے نشیب و فراز کی توجیہ اور توضیح ہمیشہ غلط اور ناقص

رہے گی، اگر افراد کی نفسیات اور اُن کے رجحانات کو نظر انداز کیا جائے خصوصاً اُن فکری اقدار کو جو ذہنوں پر مسلط ہوں[1]۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ غیر معمولی شخصیتوں کے حامل افراد، معاشرتی زندگی کو نہ صرف متاثر کرتے ہیں بلکہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں، اور افکار کے ذریعہ وہ اجتماعی انقلاب کے محرک بنتے ہیں، اگرچہ یہ بات ایک حد تک صحیح ہے کہ ان افراد کی غیر معمولی صلاحیتیں کو ماحول جِلا دیتا ہے، اور انھیں نشو ونما فراہم کرتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اس میں صداقت کا عنصر بہت کم ہے۔ یہ بات کسی درجہ میں صحیح نہیں ہے کہ فرد محض مادی اور معاشرتی ماحول کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر ہم تخلیقی قوت اور صلاحیت کے مالک افراد کے ذہنی عمل کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ صرف اپنے ماحول کا آئینہ نہیں ہوتے بلکہ وہ جو کچھ دیکھتے اور

---

[1] پچھلے کسی پیراگراف میں ہم نے اس دلیل کی طرف اشارہ کیا تھا جس کے سبب سے ماہرین معاشیات افراد کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ دلیل یہ تھی کہ بالفرض اگر افراد کی نفسیات مختلف ہوں بھی تو اس کا مجموعی حالات پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، اس لیے کہ مخالف رجحانات مثبت اور منفی شکل میں ایک دوسرے کے لیے ناسخ ہو جاتے ہیں۔ اسی دلیل کے نتیجہ میں مشینی نفسیات (MECHANISTIC) نے قبولِ عام حاصل کیا۔ لیکن یہ مفروضہ غلط ہے اس لیے کہ اختلافات غیر اہم اُسی وقت ہو سکتے ہیں جبکہ مثبت اور منفی شکلیں بالکل برابر ہوں، معاشرہ میں اتنے ہی مثبت رجحانات ہوں جتنے منفی، اسی صورت میں وہ بالآخر ایک دوسرے کو منسوخ کر سکتے ہیں۔ اقتصادیات کی اصطلاح میں اگر ایک فرد نے فاؤنٹین پن قیمتیں زیادہ ہو جانے کے باوجود (اقتصادی قانون کے علی الرغم) زیادہ خریدے تو دوسرا فرد کم خریدے گا، اس طرح ایک دوسرے کے ناسخ بن کر یہ اس قانون کو اجتماعی زندگی میں عمل درآمد کرنے دیں گے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ کم خریدے ہوئے فاؤنٹین پن زیادہ خریدے ہوئے کے مقابلہ میں زیادہ ہوں، بالفاظ دیگر اگر زیادہ خریدنے والے نے پہلے کے مقابلہ میں ۳ عدد زیادہ خریدے ہوں تو دوسرا پہلے کے مقابلہ میں کم از کم ۳ کم خریدے۔ جب ہی یہ ممکن ہوگا کہ وہ ایک طرف مخالف رجحانات کے اثر کو زائل کرے اور دوسری طرف مثبت اثرات کو ظاہر کرے لیکن معاشرتی زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مخالف اثرات زیادہ ہو جاتے ہیں اور اس طرح وہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں یہ ضروری ہے کہ منفرد رجحانات کو اہمیت دی جائے۔

دوسری غلطی اس دلیل میں پنہاں ہے کہ اس کے نزدیک منفی رجحانات ہمیشہ اُسی علاقہ میں متعارض ہوں گے جہاں مثبت رجحانات کام کر رہے ہوں، حالانکہ یہ عین ممکن ہے کہ مثبت رجحانات، اس علاقہ میں سرے سے متعارض ہی نہ ہوں۔

سمجھتے ہیں اس کو اُس پس منظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں جو اُن کی مخصوص نفسیات کا فراہم کردہ ہوتا ہے اور جب وہ اپنے احساسات اور تاثرات کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں تو وہ چیز ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ ...... سائنس داں حضرات کے بارے میں بھی یہ بات صحیح ہے۔ جہاں تک اجتماعی اور عمرانی علوم کا تعلق ہے، اُن کے متعلق تو یہ حقیقت ظاہر ہے کہ اس شعبۂ زندگی کا مطالعہ کرتے وقت طالب علم حقائق کو اُس خاص فکری اور نفسیاتی پس منظر میں رکھ کر دیکھتا ہے جو اُس کی اپنی ذاتی شخصیت کا جزو لاینفک بن چکی ہوتی ہے۔ لیکن وہ سائنس داں جو علوم طبیعی کے ماہر ہیں جنھیں معاشرتی زندگی نہیں، بلکہ غیر معاشرتی، جماداتی اور نباتاتی زندگی کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے اُن کے نظریات اُس ذہن کو کسی نہ کسی درجہ میں ضرور انعکاس کرتے ہیں جو اُن کی شخصیت کا جزو بنتا ہے۔ اس دلیل کی تردید میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ ذہنی اور نفسیاتی پس منظر جس کو آپ تخلیقی عمل کے سلسلہ میں مؤثر قرار دے رہے ہیں وہ خود بھی کسی نہ کسی ماحول کا نتیجہ ہوتا ہے یا وہ اس ورثہ کا نتیجہ ہوتا ہے جو والدین سے ملتا ہے لیکن یہ بات دو وجوہ سے ناقص ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگرچہ افراد کے رجحانات اور اُس کی شخصیت کا فکری جزو ماحول کا تربیت یافتہ ہوتا ہے، لیکن یہ بھی عین حقیقت ہے کہ وہ جب سیکڑوں اثرات کا ملغوبہ بن کر تیار ہوتا ہے تو غیر معمولی افراد میں انوکھی شکل اختیار کر جاتا ہے، اور اس طرح ماحول کا نتیجہ ہونے کے باوجود اپنی نوعیت اور تاثیر کے لحاظ سے الگ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگرچہ موجودہ اقتصادی اور معاشرتی ماحول ایک خاص قسم کے ذہن کو پروان چڑھاتا ہے، لیکن اسی دور میں آپ کو اکثر ایسے مفکرین ملیں گے جن کے نظریات و افکار انوکھی شکل کے حامل ہیں اور کسی طرح بھی انھیں صرف ماحول کا تقاضا نہیں کہا جا سکتا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اکثر اوقات یکساں ماحول دو یکساں صلاحیتوں کے حامل افراد کو بالکل ہی مختلف نتائج تک پہنچاتا ہے۔ یہ نتائج اتنے متعارض اور متضاد ہوتے ہیں کہ نہ انھیں ماحول کے جزوی اختلاف کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ طبعی اور جسمانی فروعی اختلافات کا، بلکہ انھیں کسی اہم سبب کا مرہون منت بتایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے دوسرے افراد نے جس ماحول میں تربیت پائی تھی وہ تقریباً یکساں تھا، لیکن اس کے باوجود اسی ماحول میں ابولہب اور ابوجہل بھی پیدا ہوئے، اور پھر یہ اختلاف محض کردار کا اختلاف نہیں رہا بلکہ نظریات اور رجحانات کا اختلاف بنا۔ یقیناً یہ اختلاف[1] کسی دوسرے سبب کا نتیجہ تھا۔

---

[1] ہم اس وقت وحی الٰہی کی گفتگو نہیں کر رہے ہیں بلکہ حضورؐ کی زندگی کے قبل از وحی حالات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

آئیے تھوڑی دیر کے لیے ہم یہ تسلیم کرلیں کہ افراد اقتصادی اور معاشرتی ماحول کے تابعِ محض ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود عظیم شخصیتیں ماحول کو متاثر کرتی ہیں۔ فرض کیجیے کہ شخصیت کا ہر ہر جزو ماحول سے اخذ کردہ ہوتا ہے مگر ایک بار جب یہ ملغوبہ کسی نہ کسی شکل میں تیار ہو گیا تو وہ خارجی ماحول پر ایسے عظیم الشان اثرات ڈالتا ہے جو نہ صرف اقتصادی حالات پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ پوری زندگی کو ایک خاص رُخ پر ڈھال دیتے ہیں۱۔ کیا اسٹالین اور ٹراٹسکی دونوں کی موجودگی میں روس کی حالت یکساں ہوتی؟ ہمارے نزدیک یہ ایک بہت بڑی دھاندلی ہوگی اگر کوئی شخص اس امر کا انکار کرے کہ اسٹالن کی زندگی اور اُس کے رجحانات نے روس کا سارا سیاسی نظام ایک خاص رُخ پر ڈھال دیا، اور جمہوری اقتدار کو پامال کر کے رکھ دیا۔ کیا اس حقیقت سے انکار ممکن ہے کہ اگر گاندھی جی کی قیادت میں نہیں بلکہ سبھاش بوس کی قیادت میں کانگریس کام کرتی تو دونوں کی جدوجہد کا رخ ایک جیسا نہ ہوتا۔

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کی تعبیر اور معاشرتی تبدیلیوں کی توجیہ ہمیشہ ناقص رہے گی اگر فرد کی اہمیت کو صحیح مقام نہ دیا جائے۔ اقتصادی تعبیرِ تاریخ کا یہ عظیم الشان نقص ہے، اس کی وجہ سے اس تعبیرِ تاریخ کی بنیاد پر نافذ ہونے والے اصلاحی اور تعمیری قوانین بھی ناکامی سے دوچار ہو جاتے ہیں، اور ہر قانون یہ سمجھ کر نافذ کیا جاتا ہے کہ نمائندہ انسان اور عام انسان دونوں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں — فرد کی اہمیت معلوم ہونے کے بعد ضروری ہے کہ ہم اس کی نفسیات پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈال لیں۔

اس موقع پر نہ یہ ممکن ہے اور نہ ضروری کہ ہم فرد کی نفسیات اور اس کی شخصیت کا ایسا جائزہ لیں جو علمِ نفسیات کے عین مطابق اور اصطلاحات اور طریقِ تحقیق میں اُس کا چربہ ہو۔ ہم اپنے مقصد کے پیشِ نظر یہاں صرف بعض اہم اجزاء کے متعلق گفتگو کریں گے۔ ہمارے نزدیک فرد کی شخصیت کی بنیاد اُس کی ذہنی کیفیت بنتی ہے۔ اُس کی عملی زندگی درحقیقت اُس کے تصوّرِ حیات کا نتیجہ اور پسندیدہ اقدارِ حیات کا محسوس مظہر ہوتی ہے۔

دو افراد کی عملی زندگی، اُن کی جدوجہد اور اُن کے طرزِ عمل میں جو فرق ملتا ہے اس کا اصل سبب افکار اور نظریۂ حیات کا اختلاف ہوتا ہے۔ افکار اور اقدارِ حیات نہ صرف محرکِ عمل بنتے ہیں بلکہ وہ جدوجہد کے رُخ کو

۱ـ The Practice and Theory of Bolshevism

—— B. RUSSEL

بھی متعین کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص شعوری طور پر اپنے پسندیدہ تصورات سے ہر وقت واقف ہے، اُس کے طرزِ زندگی کو متعین کرنے کے لیے بس اتنی بات کافی ہے کہ اس کے تحت الشعور میں کس قسم کے خیالات جمے ہوئے ہیں اور اس نے کس تصورِ زندگی کو قبول کیا ہے۔

لیکن فرد محض معقولیت پسند ہی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اعمال اور حرکات کے لحاظ سے فقط منطقی اور فکری مشین نہیں ہے۔ اُس کی زندگی کے مطالعہ کرنے والے یہ خوب جانتے ہیں کہ محض فکر کبھی محرک عمل نہیں بن سکتی۔ ایک شخص عقلاً اور استدلالاً ایک طریقِ حیات پر مطمئن ہونے کے باوجود اس کے مطابق اپنی زندگی میں محسوس تبدیلیاں نہیں کرتا۔ اس کے اعضا، اسی وقت سرگرم عمل ہوتے ہیں جب کہ عقلاً پسندیدہ اقدار، مرکزِ محبت بھی بن جائیں۔ یا ناپسندیدہ تصور موجبِ نفرت بھی۔ فکر بغیر جذبات کی مدد کے محرک عمل نہیں بن سکتی۔ اگرچہ وہ عمل کو متعین ضرور کرتی ہے۔ علاوہ ازیں جذبات ایک ایسی اہم قوت ہیں جو بسا اوقات عقل اور فہم کے خلاف بھی کام کرتے ہیں۔ انسان ایک چیز کو صحیح سمجھتا ہے لیکن جذبات کی رو اُسے اُس کے خلاف بہالے جاتی ہے اور وہ خود ہی اپنی پسندیدہ اقدارِ حیات کے علی الرغم اپنی حیات ترتیب دیتا ہے۔

فکر اور جذبات کا باہمی رشتہ سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے موجودہ مقصد کے پیشِ نظر اقتصادی زندگی سے چند مثالیں پیش کریں۔ معاشی نقطۂ نظر سے فرد اپنے ذرائع کو انھیں چیزوں پر صرف کرتا ہے جو اسے معاشی فلاح زیادہ سے زیادہ مقدار میں فراہم کرتے ہیں۔ انسان کی عقل کا (بشرطیکہ وہ مادی نقطۂ نگاہ کی حامل ہو) یہی فیصلہ بھی ہے لیکن ہم روز خود اپنی اور دوسروں کی زندگی میں اس کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ افراد اپنے ذرائع کو محبت اور نفرت کے جذبات کی تسکین کے لیے استعمال کرتے ہیں، اور یہ جان بوجھ کر استعمال کرتے ہیں کہ اس طرح انھیں معاشی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ ایک ایسا شخص جسے اپنے مقصد سے محبت ہو وہ اپنی ان صلاحیتوں کو جنھیں اگر وہ معاشی مقصد کے لیے استعمال کرتا تو انتہائی کامیاب ہوتا، معاشی نقطۂ نظر سے بالکل ضائع کر دیتا ہے اور اپنے اوقات اور صلاحیتوں کو مقصد کی خاطر استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح افراد ایسی چیزوں کو جو مفید اور سستی ہوتی ہیں بالکل استعمال نہیں کرتے محض اس وجہ سے کہ انھیں ان چیزوں سے یا تو نفرت ہے یا اُن کے علاوہ دوسری چیزوں سے محبت، رسم و رواج اور عادتیں بھی ایسے ہی اہم عوامل بنتے ہیں۔

جذباتِ جمیل کا ایک وہ رخ ہے جسے ہم اخلاقی اور روحانی رُخ قرار دے سکتے ہیں۔ یہ روزمرہ کے مشاہدہ کی بات ہے کہ روحانی تقاضوں کی خاطر انسان نہ صرف معاشی بلکہ دوسرے جذباتی تقاضوں کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ الغرض فرد کی شخصیت مختلف اثرات اور عوامل کا مرکب ہوتی ہے۔ اُس کی زندگی کے ان اجزائے ترکیبی کو صحیح مقام دینا بہت ضروری ہے۔ افراد کی شخصیت کا غیر جانبدارانہ جائزہ نہ لینے کا نتیجہ ہے کہ مارکس نے معاشی عامل کو آخری اور قطعی عامل اور محرک قرار دیا۔

اگر افراد اجتماعی زندگی کے اہم اجزاء ہیں، اور اگر اُن کی شخصیت مختلف عوامل اور محرکات کے تابع ہوتی ہے جو معاشی اور غیر معاشی دونوں ہو سکتے ہیں، تو معاشرتی تعبیر تاریخ میں محض معاش کس طرح اصلی اور بنیادی محرک بن سکتی ہے؟

مارکسی تعبیرِ تاریخ کی یہ وہ اصولی خامیاں تھیں جو اجتماعی زندگی کے متعلق صحیح فیصلہ پر پہنچنے میں حارج ہوتی ہیں لیکن یہ محض علمی تحقیق ہی نہیں بلکہ ایک بامقصد نظریہ بھی ہے بلکہ موجودہ زمانے میں اسے ایک اہم تحریک کی علمی اور فکری بنیاد بننے کا بھی شرف حاصل ہے، ہمارا تجزیہ مکمل نہ ہوگا اگر ہم اس کے عملی نتائج کو نہ پرکھیں اور یہ نہ دیکھیں کہ عملی دُنیا میں یہ نظریہ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود سے ہمکنار کرنے میں کتنا کارگر ہے۔

(باقی)

ماہنامہ
زندگی
رامپور
جمادی الاخریٰ و رجب ۱۳۷۷ھ
جنوری و فروری ۱۹۵۸ء
مدیر۔ سید حامد علی